اسلوبیات سرسید: ایک مطالعہ

ڈاکٹر ابوالکلام عارف

شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔110025، موبائل: 8527329065

اسلوب اپنی تحریر میں کسی خاص مقصد کے اظہار کے لیے ایک ایسے انفرادی لسانی نظام کی علامت کا نام ہے جس کے ذریعہ قارئین مصنف کو پہچانتے ہیں۔شعری اسلوب سے قطعِ نظر نثری اسلوب ترسیل کے ممکنہ انداز کو بیک وقت اپناتا ہے اور لہجہ شعری اسلوب کے مقابلے بدلتے رہنے کا تاثر دیتا ہے۔سرسید اس کی زندہ مثال ہیں کہ جب سرسید نے شاعری کے بجائے صرف نثر کو اپنے مقصد و مدعا کا اظہار بنایا تو اس امر پر زور دیا کہ اب تک نثر کی فطرت کے مطابق نثر نہیں لکھی جارہی ہے۔اس لیے سرسید نے جس علی گڑھ تحریک کی ابتدا کی اور اسے عروج تک پہنچایا اسے دوسرے لفظوں میں نثر نگاری کی تحریک بھی کہا جاسکتا ہے۔

سرسید نے نثر کی جن صنفوں میں طبع آزمائی کی ان میں مقالہ، مضمون، کسی حد تک نشائیہ، تمثیل، تاریخ، سائنسی نثر اور خالص علمی اسلوب میں اپنی نثر کو ایک سمت اور رفتار عطا کی۔گویا سرسید نے جو نثر لکھی اور جن موضوعات سے متعلق نثر سامنے آئی اس کی مثالیں ماقبل نثر کی روایت میں خال خال ہی نظر آتی ہیں۔ہاں اردو نثر میں جس صنف پر طبع آزمائی زیادہ کی گئی تھی وہ مکتوب نگاری ہے اور اس کی زندہ مثال تو خود غالب ہیں۔سرسید کے مکتوبات غالب سے مختلف اس لیے ہوگئے کہ غالب کے سامنے کوئی بڑا پروگرام نہیں تھا جبکہ سرسید کے سامنے ہزار ہا قومی، ملکی اور تہذیبی مسائل تھے۔انہیں کچھ بنانا تھا، کچھ قائم کرنا تھا، انہیں سامنا تھا مخالفین کی ایک بڑی جماعت کا جنہیں انہیں مطمئن کرنا تھا۔لہٰذا ان کے جملہ خطوط انہیں سرگرمیوں کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں، جن میں سرسید کی نثر کے اسلوبی جزرومد کا نظارہ کیا جاسکتا ہے۔کہیں افسانوی رنگ تو کہیں خالص علمی، کہیں ادق فارسی آمیز نثر از روئے تقاضائے موضوع ہے تو کہیں سادہ اور سلیس نثر۔

سرسید کے اسلوب پر جب بھی گفتگو ہوتی ہے تو ذہن فوراً سادگی، برجستگی، بے تکلفی اور سلاست و روانی کی طرف منتقل ہوجاتا ہے۔سرسید سے پہلے عام طور پر مسجع، مقفی، پرتکلف اور رنگین نثر لکھنے کا رواج تھا مگر سرسید نے سب سے علیحدہ ایک نئی راہ نکالی اور ایک نئے انداز کی نثر کی بنیاد ڈالی۔انھوں نے علمی، ادبی، سیاسی، تاریخی، اخلاقی، مذہبی، اصلاحی اور معاشرتی موضوعات کو نئے نثری اسلوب میں اس خوبی سے ڈھالا کہ دنیائے اردو آج تک سرسید کی احسان مند ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔سرسید نے نہ صرف سادگی، بے تکلفی، بے ساختگی اور سلاست و روانی پر اکتفا کیا بلکہ مدعا نگاری اور استدلالی نثر کی بنیاد بھی ڈالی۔ان کی تحریروں میں مفکرانہ سنجیدگی، تہداری، خطیبانہ اور ناصحانہ انداز، ندرتِ فکر، اصلاحی جذبہ اور تبلیغی و اسلامی جوش جابجا دکھائی دیتا ہے۔سرسید کا کمال یہ ہے کہ وہ خالص نثر لکھنے کے باوجود تشبیہات و استعارات، روزمرہ و محاورات اور محاکات نگاری کو اس انداز سے نثر کا حصہ بناتے ہیں کہ کہیں کہیں شاعری کی بو آنے لگتی ہے۔سرسید کی انشا پردازی کی انہی خوبیوں کو دیکھ کر مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

> ''سرسید کی انشا پردازی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ہر قسم کے مختلف مضامین پہ کچھ نہ کچھ، بلکہ بہت کچھ لکھا ہے اور جس مضمون کو لکھا ہے، اس درجہ پہنچا دیا ہے کہ اس سے بڑھ کر ناممکن ہے۔''
>
> (مقالاتِ شبلی، جلد دوم، ص:۱۶)

سرسید نے خود اپنے اسلوب کے متعلق لکھا ہے:

> ''ہم نے انشائیہ کا ایک ایسا طرز نکالا ہے جس میں ہر بات کو صاف صاف جیسی کہ دل میں موجود ہو، منشیانہ تکلفات سے بچ کر راست پیرایہ میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے اور لوگوں کو بھی تلقین کی ہے۔''

سرسید کی اس تحریر سے مقصدی نثر کی تائید ہوجاتی ہے۔

اسلوب انگریزی "Style" کا مترادف ہے۔جس کی اہمیت دنیا کی ہر زبان میں مسلم ہے۔ہر ادیب و فنکار کا اسلوب مختلف ہوتا ہے۔اسلوب کی تعریف دانشوروں نے اپنے اپنے طرز پر کی ہے۔بعض نے اسے آئینہ سے تعبیر کیا ہے۔آل احمد سرور نے اسلوب کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''واضح خیال کا موزوں الفاظ کا اظہار اسٹائل ہے یا دوسرے الفاظ میں اسٹائل کی موزوں تفصیل ہے۔'' (نظر اور نظریے، ص:۴۸)

نصیر الدین احمد خاں نے اسلوب کی تعریف یوں کی ہے:

> ''جوہر اعتبار سے منفرد ہو، جو ادیب و شاعر کی شخصیت کی مظہر ہو،

جو خارجی لسانی پہلوؤں کے علاوہ فنکار کے اندازِ بیان، اندازِ فکر اور اندازِ تخلیق کی ترجمانی کر سکے۔''

(ادبی اسلوبیات، ص:۹)

مذکورہ تعریفوں کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ اسلوب ہی کے ذریعہ ادیب اور اس کی تخلیق کی شناخت ہوتی ہے اور تخلیق کار کا مابہ الامتیاز متعین کیا جاتا ہے۔

سرسید اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ زبان کا بنیادی مقصد ادائے مطلب اور ترسیل و ابلاغ ہے۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ مقصد کے حصول کے لیے زبان کئی اسالیب اختیار کرتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ انہوں نے اپنی انشا پردازی میں زبان کے اطلاعی (informative)، ہدایتی (Directive) اور اظہاری (Expressive) تینوں اسالیب سے کام لیا ہے۔ ''تہذیب الاخلاق'' کا اطلاق اسلوب لسانی اعتبار سے بالعموم ایک سادہ اور سہل اسلوب ہے اور کافی حد تک اردو کے بنیادی اسلوب سے قریب ہے۔ اطلاعی اسلوب کو موثر بنانے کے لیے سرسید نے اپنی تحریروں میں جابجا انگریزی الفاظ کا مناسب، موزوں، برجستہ اور برمحل استعمال کیا ہے۔

''تہذیب الاخلاق'' کے بعض مضامین میں ہدایتی اسلوب کی بھی جھلک ملتی ہے۔ یہ اسلوب اس وقت اختیار کیا جاتا ہے جب کسی امر کو سرانجام دینے کی ہدایت دی جاتی ہے یا کسی عمل سے باز رکھنا مقصود ہوتا ہے۔ ہدایتی اسلوب کی بہترین مثالیں حکم اور استدعا کے لیے استعمال کی جانے والی زبان میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ سرسید کے مضامین "بحث و تکرار، خوشامد، تعصب، اپنی مدد آپ، تعلیم و تربیت اور مخالف" وغیرہ میں ہدایتی اسلوب کو بہ آسانی دیکھا جاسکتا ہے۔

سرسید مغربی مضمون نگاروں ایڈیسن، بیکن، ڈرائیڈن اور اسٹیل سے کافی متاثر تھے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ سرسید نے تہذیب الاخلاق میں ایک مغربی نثری صنف "Essay" کی طرز پر اردو میں مضمون نگاری شروع کی۔ انھوں نے بعض مغربی انشائیہ نگاروں کے مضامین کو اردو میں منتقل کیا۔ تہذیب الاخلاق کے اجرا میں سرسید نے وہی مقاصد پیش نظر رکھے جو انگریزی اخبارات ٹیٹلر (Tatler) اور اسپیکٹیٹر (Spectator) کے تھے۔ اس کے اجرا سے ادب کی نشاۃ ثانیہ اور مغربی خیالات و افکار کو اردو میں سمونے کی ابتدا ہوئی۔ اس میں تصنع کی جگہ سادگی اور الفاظ کی مینا کاری کے بجائے مضمون و معانی کی ادائیگی کو اولیت دی گئی۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اردو نثر کی ترقی و ترویج میں تہذیب الاخلاق کا بڑا دخل ہے جس کی نثر نے اردو کو علمی، ادبی، معاشرتی اور تہذیبی اقدار سے مالا مال کیا اور لوگوں کے ذہنوں کو جلا بخشی۔

ادیب و فنکار کے اسلوب کا اندازہ اس کے خطوط سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ خطوط فنکار کی زندگی کے حالات اور خاندانی عقائد و نظریات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ مکتوب نگار میں اگر انشا پردازی کے جوہر دکھانے کی صلاحیت موجود ہے تو اس کا اسلوب خطوں میں چار چاند لگا دیتا ہے۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی نے جگر کے خطوط پر تعارف پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

''فنکار کی شخصیت جس طرح خطوط میں بے نقاب ہوتی ہے، کسی اور صنف ادب میں ممکن نہیں۔ خطوط اس کی شخصیت کا آئینہ ہوتے ہیں اور ایکسرے بھی.... خطوط میں فنکار کی ظاہری و باطنی، تمام باتوں کا عکس آجاتا ہے۔''

(تعارف: جگر کے خطوط، مؤلف: محمد اسلام، ص:۱۱)

سرسید کے خطوط کا مجموعہ ''مکاتیب سرسید'' کے عنوان سے منظرِ عام پر آیا تو ادبی و علمی حلقوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی کیونکہ سرسید کے ان مکتوبات میں سلیس اور عام فہم زبان کا استعمال کیا گیا تھا۔ اس میں عبارت آرائی اور تکلف و تصنع سے اجتناب، بے مقصد باتوں سے احتراز، کارآمد گفتگو پر اکتفا اور ظرافت و شگفتگی کی آمیزش تھی۔ مکتوبات سرسید کی انہی خوبیوں کو دیکھ کر ڈاکٹر سید عبداللہ نے بجا فرمایا ہے:

''سرسید احمد خاں کے خطوط اگرچہ ان کے مقالات کی طرح گراں وزن اور متین ہیں مگر بے تکلفی کا ایک خاص انداز ان کے خطوط میں پایا جاتا ہے۔ ان کے خطوط کی فضا ان کی باقی تحریروں کے مقابلے میں دلچسپ اور مانوس بھی ہے اور ظرافت و زندہ دلی بھی ان خطوط میں زیادہ حد تک پائی جاتی ہے۔''

(سرسید احمد خاں اور ان کے نادر رفقا کی نثر کا فکری و فنی جائزہ، ص:۲۵۰۔۲۵۱)

آل احمد سرور نے اپنے مقالے ''خطوط میں شخصیت'' کے تحت غالب کے خطوط سے موازنہ کرتے ہوئے سرسید کے خطوط کو غیر دلچسپ قرار دیا ہے:

''سرسید کے خط غالب کے خطوط کی طرح دلچسپ نہیں ہیں۔ سرسید کے یہاں نہ کوئی راز ہے جس سے پردہ اٹھنے میں دلچسپی ہو، نہ نشیب و فراز ہیں جن سے گزر کر انسان ہمتوں کی پستی اور شوق کا نظارہ کرے۔ وہ انگلستان میں بھی وہاں کی حوروں کو دیکھ کر صرف یہ کہتے ہیں کہ جنت کا ہونا سچ ہے مگر ان کی قسمت میں وہی قوم کا رونا ہے۔ سرسید کی دراصل کوئی پرائیوٹ لائف تھی ہی نہیں۔ ان کے یہاں یہی قومی خدمت کا جذبہ ہے جو ہر رنگ میں اور ہر جگہ نظر آتا ہے۔'' (تنقیدی اشارے، ص:۶۶)

سرسید کے خطوط کے ضمن میں سرور کا مذکورہ بیان صداقت پر مبنی نہیں

ہے۔ سرسید کے سیکڑوں خطوط انتہائی دلچسپ ہیں جن میں بے تکلفی، برجستگی اور ظرافت وخوش طبعی پائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر حکیم احمد الدین کے نام ایک خط ملاحظہ کیجئے جو پراثر بھی ہے اور دل پذیر بھی ہے۔ اس خط میں سرسید نے اپنی بہن کی علالت کے بارے میں خیریت دریافت کی ہے:

''عزیزی احمد الدین! تمہارا خط پہنچا، ہمشیرہ کی علالتِ طبع جو حد سے زیادہ ہوگئی ہے اس کا مجھ کو نہایت رنج ہے۔ میں ہر چند دل کو دہلی آنے پر مضبوط کرتا ہوں مگر وہاں کے مکانات اور سید حامد مرحوم کا رنج اس قدر دل پر اثر کرتا ہے کہ قدم نہیں اٹھتا۔ اب تک سید حامد مرحوم کا غم میرے دل سے کم نہیں ہوا۔ یہاں اور کاموں میں دن گزر جاتا ہے مگر دہلی کے خیال سے غم تازہ ہوجاتا ہے.... اگر قسمت میں ملنا ہے تو میں آکر ملوں گا، تم ان کے حال کا برابر خط لکھتے رہو۔''

(مکتوباتِ سرسید، جلد:۱، مرتبہ:اسماعیل پانی پتی، ص:۲۴)

سرسید کے دوستوں میں سب سے زیادہ مخلص، عزیز اور بے تکلف دوست خان بہادر سید زین العابدین تھے۔ ۱۳؍مئی ۱۸۸۹ء کو زین العابدین کے نام لکھے خط میں سرسید نے جس دلی جذبات واحساسات کا اظہار کیا ہے وہ دل کو چھو لینے والے ہیں:

''مکرمی زینو بھیا!

ابھی تمہارا خط پہنچا۔ کچھ شبہ نہیں کہ تم کو مجھ سے جدا ہونے کا ایسا ہی رنج ہے جیسا کہ تم نے لکھا ہے مگر تم تو اس رنج کو کسی قدر لکھ بھی سکے مگر مجھ کو تمہارے چلے جانے سے جو رنج ہے وہ لکھا بھی نہیں جاسکتا۔ زبان کھجلاتی ہے اور کوئی یہاں نہیں کہ اس کو برا کہوں..... ہاتھ کھجاتے ہیں اور کوئی یہاں نہیں ہے جس کو ماروں۔ حقیقت میں تمہارے جانے سے مکان سونا نہیں ہوا بلکہ دل سونا ہوگیا۔ صبح اٹھ کر خدا یاد نہیں آتا مگر تم یاد آتے ہو۔''

(خطوط سرسید، مرتبہ:راس مسعود، ص:۱۱۸)

سرسید کے عزیز دوستوں میں مولوی سید ممتاز علی کا نام قابل ذکر ہے کہ ان کے نام سرسید کے ۱۰۷ خطوط دستیاب ہوئے ہیں۔ اتنی بڑی تعداد میں سرسید کے خطوط کسی اور کے نام نہیں۔ ۱۶؍اگست ۱۸۸۴ء میں ممتاز علی کے نام لکھے گئے خط میں شوخی اور ظرافت کا ایک انداز ملاحظہ کیجئے:

''محبی ومکرمی!

آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ جس جوشِ محبت سے آپ نے وہ عنایت نامہ لکھا ہے اس کا دل سے شکر گزار ہوں۔ سول اسٹیشن میں مطلقاً بیماری نہیں ہے اور شہر میں بھی نہایت کم ہے۔ گو ہم نیچری ہیں، لیکن ہم کو خدا پر مولویوں سے زیادہ بھروسہ ہے۔ میں تفسیر لکھنے میں بہت مشغول ہوں اور نہایت مشکل مشکل مقام لکھ چکا ہوں۔ آپ دیوبند میں کب تک قیام کریں گے۔ والسلام''

(مکتوبات سرسید، جلد:دوم، مرتبہ:اسماعیل پانی پتی، ص:۱۳۶)

اس طرح کی مثالیں اور بھی دی جاسکتی ہیں، لیکن یہاں اس کا موقع نہیں ہے۔

سادگی اور سلاست سرسید کے اسلوب کی اہم خصوصیات ہیں وہ اس سادگی سے مضمون کو الفاظ کا جامہ پہناتے ہیں کہ قاری بلا جھجک پڑھتا چلا جاتا ہے۔ صداقت، اثر آفرینی اور درد واثر بھی سرسید کی تحریروں کا اہم حصہ ہیں۔ سرسید کا کمال یہ بھی ہے کہ جب وہ خشک موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو اسے رواں دواں کردیتے ہیں۔ مشکل ترین موضوعات پر جب خامہ فرسائی کرتے ہیں تو اس میں روانی اس قدر پیدا کردیتے ہیں کہ قاری اس کی رو میں بہتا چلا جاتا ہے۔ سرسید کے مضامین میں تمثیلی انداز کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ ''امید کی خوشی'' میں عمدہ تمثیل کا دیدار کیا جاسکتا ہے:

''اے آسمانوں کی روشنی اور اے ناامید دلوں کی تسلی امید! تیرے ہی شاداب اور سرسبز باغ سے ہر ایک محنت کا پھل ملتا ہے۔''

(مضامین سرسید، ص:۱۰۱)

اردو میں استدلالی نثر کی بنیاد سرسید نے ہی ڈالی۔ وہ جو کچھ بھی لکھتے ہیں اس کی دلیل ضرور پیش کرتے ہیں ''آدم کی سرگزشت، امید کی خوشی، نادان دیندار اور دانا پرست'' جیسے درجنوں مضامین استدلالی نثر کی زندہ مثالیں ہیں۔ سرسید کی تحریروں میں خطیبانہ اسلوب سب سے زیادہ ملتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ پوری قوم سے خطاب کررہے تھے۔ محسنِ قوم سرسید متنوع موضوعات کی مناسبت سے متنوع اسلوب بھی اپناتے ہیں۔ اگر تاریخ لکھ رہے ہیں تو مورخوں کا انداز، سیرت، تفسیر اور فلسفہ وغیرہ میں مفسرانہ اور عالمانہ انداز۔ غرض کہ ادبی، علمی، سماجی، سیاسی اور اخلاقی موضوعات کے لیے موضوع کی مناسبت سے اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ سرسید کے موضوعات کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر مشتاق احمد نے درست لکھا ہے:

''علم وادب، تاریخ وتنقید، سیر وتفریح، مذہب وسیاست، تہذیب و معاشرت، عقل وحکمت، مادیت وروحانیت، مغرب ومشرق اور قدیم وجدید کا کوئی ایسا گوشہ نہیں ملتا جس پر سرسید نے قلم نہ اٹھایا ہو اور اسے کامیابی سے نہ برتا ہو۔''

(سرسید کی نثری خدمات، ص:۱۳۰)

کہا جاسکتا ہے کہ سرسید کا اسلوب اردو کے بنیادی اسالیب سے انحراف کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ یہی ان کے اسلوب کی امتیازی شان ہے اور اسی میں ان کی انفرادیت مضمر ہے۔ ◆◆◆